تعلیم فی سبیل اللہ

پروفیسر سید محمد سلیم

تعلیم فی سبیل اللہ

پروفیسر سید محمد سلیم

تعلیم فی سبیل اللہ کا احیا

وقت کی ضرورت

انسان فی الحقیقت ایک روحانی مخلوق ہے۔ روح نے اپنے اظہار کے لیے مادی جسم کا قالب اختیار کرلیا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں:

پیکر از ماھست شد نے ما از و بادہ از ما مست شد نے ما از و

(یہ جسم ہماری وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ ہم اس کی وجہ سے وجود میں نہیں آئے ہیں۔ شراب نے نشہ ہم سے لیا ہے، ہم نے شراب سے نہیں لیا ہے۔)

شیخ سعدی فرماتے ہیں:

ما پرتو نور بادشاہ الستیم فرزند نہ ایم آدم وحوّا را

(ہم بادشاہِ است (اللہ تعالیٰ) کے نور کا عکس ہیں۔ ہم آدم وحوا کے فرزند نہیں ہیں۔ روح اپنی مادی کارگزاری جسم کے ذریعہ انجام دیتی ہے اور فکری کارگزاری عقل کے ذریعہ انجام دیتی ہے۔)

انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ انسان کی دنیاوی زندگی ایک امتحان اور آزمائش ہے۔ جسمانی قوتیں، فکری صلاحیتیں، مدتِ حیات، ار دیگر نعمتیں درحقیقت امتحان کے ذرائع اور وسائل ہیں۔ یہ خود مقصود اور مطلوب نہیں ہیں۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان ان نعمتوں کو استعمال کرے، اور زندگی میں بھرپور حسنِ عمل کا مظاہرہ کرے۔ تاکہ وہ خلافت کے عظیم امتحان میں کامیاب قرار دیا جائے۔ اور آخرت میں انعامات کا مستحق قرار پائے۔

اس لیے انسان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ، وہ بحیثیت خلیفہ اپنے مالک کی مرضی اور منشا معلوم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مقصد سے انبیا کرام علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اب آخری کتابِ ہدایت قرآن مجید ہے۔ اور آخری اُسوۂ ہدایت سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ نیک انسان کے لیے خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے اس ہدایت کا علم حاصل ہونا ضروری ہے تاکہ، اسے اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند معلوم ہو اور وہ اطاعت و فرمان برداری کی زندگی گزارے۔

یہ تعلیم جو فرضِ عین ہے، اور جس کا حصول ہر مسلمان کے لیے لازم ہے، انسان کو راہِ حق دکھاتی ہے۔ تعلیم کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ب بہت سی احادیث منقول ہیں مثلاً

1۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (مسلم)

2۔ یا تو علم کا جاننے والا بنو، یا علم کا سیکھنے والا بنو، یا علم کا سننے والا بنو، یا علم کو پسند کرنے والا بنو اور پانچویں صورت نہ ہو۔ (طبرانی)

3۔ ہر مسلمان پر خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ قرآن سیکھے اور ضرور کچھ نہ کچھ مسائل جانے۔ (تفسیر قرطبی۔ ج4۔ ص121)

4۔ جس شخص کے سینے میں قرآن مجید کا ذرا سا حصہ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ویران گھر کی مانند ہے۔ (جس میں کوئی آباد نہیں ہوتا) (ترمذی)

5۔ تم سے بہترین آدمی وہ ہے جس نے قرآن مجید پڑھا اور پھر دوسروں کو پڑھایا۔ (بخاری)

چند دوسری احادیث میں آپ نے علم جاننے والے کو ترغیب دی ہے کہ وہ علم پھیلائے:

1۔ جس شخص سے علم کے متعلق سوال کیا گیا اور اس نے اس کو ظاہر نہیں کیا تو قیامت کے

دن اس کے منہ میں آگ کے لگام لگائی جائے گی۔(ابوداؤد۔ترمذی)

2۔ فرشتے، آسماں و زمین کے باشندے، حتیٰ کے بلوں میں رہنے والی چیونٹیاں حتیٰ کی مچھلیاں بھی انسانوں کو نیکی اور خیر کی تعلیم دینے والے استاد کے حق میں دعائے خیر کہتی ہیں۔(ترمذی)

3۔ استاد اور شاگرد تعلیم کے اجروثواب میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، تعلیم یافتہ افراد کو تعلیم دینے کی آپ نے صرف ترغیب ہی نہیں دی بلکہ علوم کی اشاعت نہ کرنے پر وعیدیں سنائی ہیں:

جس شخص کے پاس کچھ علم ہے اس کو زیب نہیں دیتا کہ وہ خود کو ضائع کرے۔یعنی نہ خود فائدہ اٹھائے، نہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے تو گویا اس طرح اس نے خود کو ضائع کرلیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث ترغیب دیتی ہیں کہ جس مسلمان نے قرآن مجید نہیں پڑھا ہے وہ پہلی فرصت میں قرآن مجید پڑھے، ویران گھر نہ بنے۔ یہ احادیث اس بات کی بھی ترغیب دیتی ہیں کہ جس مسلمان کو علم کی دولت حاصل ہے اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دے اور فیض پہنچائے۔یہی نہیں بلکہ تعلیم نہ دینے والے، فیض نہ پہنچانے والے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے دن سخت عذاب کی وعید سنائی ہے۔ان احادیث میں جو دوسری بات نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ شاگرد ہوں یا استاد۔۔۔۔ دونوں کے لیے اجر کی بشارت آخرت میں دی گئی ہے۔اس لیے کہ تعلیم عبادت ہے اور عبادت کا اجر آخرت میں ملے گا۔

تعلیم حاصل کرنا اور تعلیم دینا دونوں کارِ عبادت ہیں۔جس طرح نماز کے لیے کوئی فیس نہیں ہے اسی طرح علم حاصل کرنے کی بھی کوئی فیس نہیں ہے۔اھلِ محلہ کا جس طرح یہ فرض ہے کہ، وہ نماز کے لیے سہولت مہیا کریں۔مسجد کی تعمیر کریں، امام مقرر کریں، اسی طرح مسلمان اہلِ محلہ کا فرض ہے کہ تعلیم کی سہولت مہیاں کریں، مدرسے قائم کریں، استاد مقرر

کریں۔ طلبہ مسافر ہوں تو ان کے قیام کا اور خورد ونوش کا انتظام کریں۔ ان کی ضروریات فراہم کریں۔ اسبابِ تعلیم فراہم کریں۔ ضروری ہوگا ان امور کی انجام دہی کے لیے کوئی باقاعدہ نظم قائم کیا جائے۔

استاد کے مشاہرے اور مسلمانوں کی تعلیمی روایت

استاد کے مشاہرے کے سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسلام کا نقطہ نظر بڑے واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔ امام جوزی لکھتے ہیں:

''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یزید بن ابی مالک ومشقی اور حارث بن ابی محمد اشعری کو دیہات کے لیے گشتی معلم مقرر کیا، تاکہ وہ دیہاتیوں کو تعلیم دیں۔ دونوں کے لیے آپ نے بیت المال سے تنخواہ جاری فرمادی۔ یزید نے قبول کرلی۔ حارث نے بربنائے تقویٰ تنخواہ لینے سے انکار کردیا۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا:

''یزید نے جو کچھ کیا اس میں کوئی خرابی نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ حارث جیسے افراد کثرت سے پیدا کرے۔''

یعنی معاوضہ وصول کرنے میں کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن تقویٰ کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ انسان فی سبیل اللہ تعلیم دے اور تعلیم کا کوئی معاوضہ وصول نہ کرے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے آئمہ کرام اور ایسے اساتذۂ عظم کم نہیں ہیں، جو درس وتدریس کا فریضہ فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے۔ امام مالک مدینہ منورہ میں اور امام ابوحنیفہ کوفہ میں فی سبیل اللہ تعلیم دیتے تھے۔ علمائے کرام اور اساتذہ کے علاوہ عام دنیادار مگر اہلِ علم بھی طلبہ کو فی سبیل اللہ تعلیم دیتے تھے۔ سامانیوں کے وزیر، حکیم بوعلی سینا، اکبر بادشہ کا وزیر حکیم فتح اللہ شیرازی، اکبر بادشاہ کا سمدھی اور لاہور کا عامل قلیچ خاں اپنی سرکاری مشغولیات سے فراغت کا وقت نکالتے تھے اور طلبہ کو تعلیم دیتے تھے۔ یہ لوگ اس لیے تعلیم دیتے تھے کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق کہیں علم کو چھپانے کے مجرم نہ قرار دیئے جائیں۔ صاحب بن عباد اور سلطان

صلاح الدین ایوبی حکومتی ذمہ داریوں کے باوجود تعلیم دیتے تھے۔ یہ اسلامی معاشرہ کی خصوصیت ہے کہ، جہاں علماء کے ساتھ ساتھ حکمران، وزراء، عمال، امراء، عوام الناس ہر قسم کے افراد فی سبیل اللہ تعلیم دیتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں تعلیم ایک معاشرتی عمل تھا جس میں معاشرہ کا تقریباً ہر فرد حصہ لیتا نظر آتا ہے۔

جہاں کہیں مسلمان معاشرہ قائم تھا وہاں یہ خصوصیت بھی موجود تھی اور اسلامی حکومت کے آخری ایام تک موجود رہی۔ فتحِ پنجاب کے بعد انگریزوں نے پنجاب میں تعلیم کی رپورٹ تیار کروائی۔ (1856ء) آرنلڈ اس رپورٹ میں لکھتا ہے کہ سکھوں کے دورِ حکومت میں تعلیم کا شعبہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ہندو اور سکھ بھی مسلمان استاتذہ سے ہی پڑھتے تھے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ مسلمان اساتذہ کی غالب اکثریت فی سبیل اللہ تعلیم دیتی ہے۔

تعلیم کے لیے اہلِ خیر کا انفاق

دولت مند افراد ہر زمانہ میں اور ہر معاشرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسلام نے دولت پر کوئی بندش عائد نہیں کی البتہ دولت مند افراد کی ذہنیت کو خاص نہج پر تشکیل دیا۔ قرآن دولت مندوں سے کہتا ہے۔ دولت کے عملاً تم مالک ہو لیکن درحقیقت امین ہو۔ مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ مال تمہارا ہے لیکن دوسرے افراد کا بھی اس میں حق ہے۔ اس وجہ سے اسلامی معاشرے کے دولت مند افراد مختلف طریقوں سے معاشرہ کے محروم طبقوں کی امداد کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ اس انفاق میں تعلیم کو ترجیحی مقام حاصل تھا۔ مدرسے کے مصارف پورا کرنے کے لیے اوقاف قائم کرتے تھے۔ ان مدرسوں میں ہر طبقہ کے افراد کے بچے پڑھتے تھے، اس کے اپنے بچے بھی یہیں پڑھتے تھے۔ مدرسہ کے نادار بچوں کو وہ اپنے گھر پر رکھتے تھے، اپنے بچوں کی طرح نگہداشت کرتے تھے کبھی وہ استاد کو اپنے گھر پر رکھتے تو

استاد سے جہاں اس کے بچے پڑھتے تھے، وہاں محلے کے دوسرے بچے بھی امیر کے گھر میں آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ تعلیم کے لیے کوئی منع نہیں کرتا تھا۔ نہ استاد، نہ امیر۔ اس طرح تعلیم میں یکسانیت اور مساوات رہتی تھی۔ جو تعلیم ایک امیر کا بچہ حاصل کرتا، وہی تعلیم چپراسی کا بچہ بھی حاصل کرتا تھا، اور اسی استاد سے حاصل کرتا تھا۔ چپراسی نادار تھا۔ مگر ناداری اس کے بچے کو اعلیٰ تعلیم دلانے میں مانع نہیں آتی تھی۔ وہاں غریب کو حسرت نہیں ہوتی تھی کہ 'کاش! میرا بچہ کسی اعلیٰ قسم کے ادارے میں تعلیم حاصل کرتا'۔

تعلیمی تاریخ میں یہ اسلامی تہذیب کا کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس نے تعلیم کو خاص و عام کی تفریق کے بغیر سب کے لیے فراہم کیا۔

اجتماعی عمل۔ سب کی شرکت

اسلامی معاشرہ میں تعلیم ایک اجتماعی عمل تھا۔ محلہ اور گاؤں کے تمام افراد اس میں دلچسپی لیتے تھے اور اس میں حصہ دار بنتے تھے۔ مدرسے قائم کیے جاتے تھے اور ان کے تمام اخراجات اس معاشرے کے افراد بقدرِ استطاعت اس میں ہاتھ بٹا کر پورے کر دیتے تھے۔ اس طرح اہلِ ثروت معاشرہ سے پوری طرح منسلک اور وابستہ رہتے تھے اور عوام کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے۔ محلہ کے کم وسیلہ افراد ان کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ سمجھتے تھے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ دولت مند افراد معاشرہ سے کٹ کر نہیں رہتے تھے۔ زرداروں میں اور ناداروں میں بُعد اور بیگانگی نہیں تھی۔ طبقہ واریت بھی نہ تھی۔ اس دور کے امراء میں خود غرضی اور بے تعلقی کا انداز نہیں تھا۔ طبقاتی علیحدگی، جداگانہ کالونیاں، جداگانہ معاشرہ، جداگانہ تعلیم گاہیں، جداگانہ ذہنیت کی موجودہ کیفیت مغربی تہذیب کے ثمرات ہیں۔ اس نام نہاد تہذیب کا اُس دور میں پتا نہیں چلتا۔

تعلیم عمل کی آزادی:

تعلیم فی سبیل اللہ کا ایک فائدہ یہ تھا کہ، تعلیم عوام کے ہاتھوں میں تھی اور درباروں اور

ایوانوں سے آزاد تھی۔ مدرسہ قائم کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے ضابطے، لوازمے کی ضرورت نہیں تھی۔ مقیم طلبہ اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ مسافر طلبہ مسجد کے حجروں میں رہتے تھے۔ اہلِ محلہ ان طلبہ کو کھانا بھیجتے تھے۔ تقریبات میں ان کو گھر بلا کر کھانا کھلاتے تھے۔ ضروریات فراہم کرتے تھے۔ سال میں ایک یا دو مرتبہ ان کو کپڑے بنا کر دیتے تھے۔ طلبہ کے ساتھ استاد کی بھی خدمت کرتے تھے۔ سارا کام کفایت شعاری سے اور فی سبیل اللہ ہوتا تھا۔ نہ دینے والا احسان دھرتا تھا، نہ لیتے والا محجوب ہوتا تھا۔ ان طلبہ کو معزز محترم سمجھا جاتا تھا۔ ہرگز نا کی تحقیر نہیں کی جاتی تھی اور استاد کی تو امراء سے بڑھ کر غیر معمولی عزت ہوتی تھی۔ یہ سب اس لیے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان تھا۔

’ان طالبانِ علم کے ساتھ بھلائی کے ساتھ پیش آؤ‘

تعلیمی عمل کی آزادی

اسلامی تعلیم کی یہ تحریک علماء کے ہاتھ میں تھی اور نوکر شاہی کی مداخلت سے بے نیاز تھی۔ اس کے باوجود یہ ایک منظم تحریک تھی آزادانہ طور پر مدارس قائم ہوتے تھے۔ جن کا ملک کے چپے چپے پر جال پھیلا ہوا تھا۔ حصولِ تعلیم کے سلسلہ میں کوئی شخص عذر نہیں پیش کرسکتا تھا کہ، اسے تعلیم کی سہولت میسر نہیں ہے۔ یہ خود کار تعلیمی تحریک سارے ملک کی تعلیمی ضروریات کی کفیل بن گئی تھی۔ انگریزی حکومت کے آغاز میں بعض انگریز مصنفین کا یہ بیانِ اعتراف موجود ہے کہ اُس وقت بنگال میں تقریباً سو فیصد خواندگی موجود تھی اور ایسا شخص تو شاید مشکل ہی سے ملتا تھا، جس نے قرآن مجید ناظرہ تک نہ پڑھا ہو۔ خواتین بھی قرآن مجید ناظرہ پڑھتی تھیں۔ ہیملٹن، ٹھٹھہ کے متعلق لکھتا ہے کہ ایک شہر میں چار سو مدرسے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دور میں تعلیم کس قدر عام تھی اور معاشرہ اس سے کس قدر دلچسپی لیتا تھا۔ انگریز کی دانستہ پالیسی کے تحت تعلیم میں انحطاط شروع ہوا ہے اور ناخواندگی میں اضافہ ہوا ہے۔

مسلم تعلیمی نظام کے بربادی کے لیے اہلِ مغرب کے اقدامات

تقریباً ڈیڑھ صدی مغربی اقوام کا عالمِ اسلام کے بڑے حصہ پر غلبہ رہا ہے۔ مغربی استعماری حکمتِ عملی نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام کے نظامِ تعلیم کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا۔ حکومت کی سرپرستی میں جو نظامِ تعلیم ملک میں رائج ہوا حکومت بس اسی کو تعلیم قرار دیتی تھی۔ ملک میں جو ہزاروں مدارس کھلے ہوئے تھے وہ ان کی نگاہ میں تعلیم نہیں دے رہے تھے۔ صرف حکومتی تعلیم گاہوں سے فارغ ہونے والوں کو تعلیم یافتہ قرار دیا جاتا تھا۔ 1871ء کی مردم شماری میں حکومت نے اسلامی تعلیم یافتہ تمام اشخاص کو ناخواندہ قرار دے دیا۔ حکومت نے اجرائے مدارس کا حق عوام سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اب تعلیم صرف وہ تھی جو سرکاری مدارس میں یا سرکار کے تسلیم شدہ مدارس میں حاصل کی جائے۔ اگر کسی نے غیر تسلیم شدہ مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے، تو اسے تعلیم یافہت نہیں کہا جاتا تھا۔ اس اقدام نے مسلمانوں کی ہزار سالہ تعلیمی روایات کو روند ڈالا۔ پڑھے لکھوں کو بیٹھے بٹھائے ''جاہل'' قرار دے دیا گیا۔ رزق کے دروازے جدید تعلیم کے لیے کھول کر دیے گئے۔ قدیم تعلیم یافتہ پر رزق کے دروازے بند کر دیے گئے۔ استعمار نے تعلیم کو شکم پروری کے ساتھ منسلک کر دیا اور لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ دو وقت کی روٹی حاصل کرنا ہے تو سرکاری تعلیم گاہوں میں آؤ۔ اس طرح اسلامی نظام تعلیم کا گلا گھونٹ دیا گیا۔

مغربی تعلیم

مغربی تعلیم مغرب کی سرمایہ دارانہ تہذیب کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ طبقات پیدا کرتی ہے۔ تعلیم کا رشتہ دولت سے بندھا ہوا ہے۔ جتنی اچھی تعلیم اتنی ہی مہنگی تعلیم۔ یہاں ساری نعمتیں سرمایہ داروں کے لیے ہیں۔ مغربی اقوام نے استعماری دور میں بلاشبہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں بڑے کالج بڑی بڑی یونی ورسٹیاں اور ان کی پُرشکوہ عالی شان عمارتیں تعمیر کیں۔ مگر یہ سب کچھ سرمایہ داروں کے لیے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان عظیم تعلیم گاہوں سے

ملک کے باشندوں کی ایک قلیل تعداد ہی مستفید ہوئی۔ ملک کی باقی کثیر آبادی ناخواندہ قرار پا گئی۔ مغربی تعلیم نے مزید ظلم یہ کیا کہ ایک ہی معاشرہ کو طبقات اور گروہوں میں تقسیم کر ڈالا۔ اعلیٰ طبقات کے افراد کے بچے اعلیٰ درس گاہوں میں اعلیٰ معیار کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ادنیٰ طبقات کے لوگ ادنیٰ اسکولوں میں فروتر تعلیم پاتے ہیں۔ مغربی نظامِ تعلیم نے معاشرہ میں طبقات پیدا کر دیے۔ طبقات میں کشیدگی ہے۔ اعلیٰ طبقہ میں اسلامی دور کے اخوت اور ہمدردی کے تصورات اب مفقود ہو گئے ہیں۔

ناخواندگی کا مسئلہ

جب ایشیا اور افریقہ کے ممالک مغربی استعمار سے آزاد ہو گئے تو قومی تشکیل کے ضمن میں سب سے بڑا بھیانک مسئلہ ان کے سامنے 'عظیم ناخواندگی' کا ہے۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان ملکوں کے لیے نہایت پریشان کن ہے جن کی آبادی کروڑوں سے بھی متجاوز ہے۔ انہیں محسوس ہوا کہ مغرب نے اپنے نظامِ تعلیم سے صدی ڈیڑھ صدی میں نہایت ہی قلیل سی تعداد کو خواندہ بنایا ہے۔ مغربی انداز کار پر اگر پوری قوم کو خواندہ بنانا ہو تو اس کے لیے صدیوں کی مدت اور اربوں کھربوں کی دولت درکار ہے۔ اس لیے مغربی تعلیم ان کے درد کا مداوا نہیں ہے۔ یہ ان کا مسئلہ حل نہیں کر سکتی۔ ان کی ضرورت ایک کم خرچ اور آسان نظامِ تعلیم ہے۔ اس لیے ایشیا اور افریقہ کی فہمیدہ حکومتیں قدیم مشرقی روایات کو زندہ کر کے اپنی تاریخی روایات کو دوبارہ فروغ دے رہی ہیں۔

بعض مثالیں

چین کی آبادی ایک ارب کے لگ بھگ ہے۔ مغربی انداز پر چینی قوم کو خواندہ بنانا بہت مشکل اور تقریباً ناممکن ہے۔ تعلیم کا مسئلہ حل کرنے کے لیے انہوں نے اپنی قدیم روایات کو زندہ کیا ہے۔ اور برہنہ پا استاد (Bare footed teacher) کے ذریعے تعلیمی سہولت عام کی ہے۔ (اور برہنہ پا ڈاکٹروں کے ذریعے علاج معالجے کا مسئلہ حل کیا

ہے) چین کی تعلیمی اسکیم کے دو اجزاء سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ حد درجہ سادہ اور حد درجہ کم خرچ ہے۔ سارا انحصار استاد کی ذات پر ہے۔ استاد گاؤں کی معاشرت کا ایک فرد ہوتا ہے۔ جیسے وہ ننگے پیر رہتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ننگے پیر رہتا ہے۔ انہی کی طرح زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ باہر سے آمدہ کوئی حاکم یا افسر محسوس نہیں ہوتا۔ اسے تعلیم دینے کے لیے بلڈنگ اور بلڈنگ کے لوازمات کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس کی ساری کائنات ایک تختہ سیاہ ہوتی ہے جس کو وہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اس کی ذات متحرک ہے اس لیے اسکول بھی متحرک ہے۔ کبھی اس درخت کے نیچے، کبھی اس ندی کے کنارے۔ وہ چند متعین دیہاتوں میں گھومتا پھرتا ہے اور وہاں تعلیم دیتا رہتا ہے۔ اس طرح جدید چینی حکومت نے عوامی تعلیم کی ایک رو جاری کردی ہے۔ بیک وقت لاکھوں افراد استاد بن کر تعلیم دے رہے ہیں اور کروڑوں افراد طالب علم بن کر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس طرح نہایت کم وسائل سے عمومی تعلیم پھیل رہی ہے۔

ہندوستان کی آبادی 65 کروڑ بھی متجاوز ہے۔ اس کے سامنے بھی یہی بھیانک مسئلہ ہے۔

ہندو راہنماؤں نے اس صدی کے آغاز سے ہی تعلیم کو عوامی بنانا شروع کر دیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے 1915ء میں وشوا بھارتی ودیالیہ شانتی نکیتین (یونیورسٹی) قائم کی۔ جہاں استاد اور شاگرد درختوں کے سایہ میں زمین میں بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ انہوں نے 'گروکل کانگڑی' 'ودیّا پیٹھ' احمد آباد 'شکتا گھر، پٹنہ میں قدیم آریائی معاشرت کو زندہ کرنے کی شعوری کوشش کی۔ ملک میں کتنے اور بھی ادارے قائم ہوئے جہاں سادہ زندگی اور کم خرچ تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

افریقی ممالک میں مغربی ممالک نے بڑے مظالم کیے ہیں۔ ان کے ساتھ بھیڑ بکریوں کا سا برتاؤ کیا۔ ان کے معاشرہ میں بڑی شکست و ریخت کی۔ مگر ان کا مخصوص نظامِ تعلیم ''خلّوہ'' سارے صدمات سہہ گیا۔ وسط افریقہ کے ممالک۔ سوڈان، چاڈ، نائجر وغیرہ

میں یہ طریقہ رائج ہے کہ گاؤں میں ایک بڑا سا چھپر ہوتا ہے۔ یہ ان کا مدرسہ ہے اس کو خلوہ کہتے ہیں۔ چھپر کے وسط میں آگ کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہ آگ 24 گھنٹے اور بارہ مہینے روشن رہتی ہے۔ لکڑی ڈالتے رہتے ہیں۔ راکھ بھی جمع رہتی ہے۔ ایک ٹیلہ سا بن جاتا ہے۔ وہاں کا استاد فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ ''اس آگ کو میرے دادا نے روشن کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مدرسہ کو میرے دادا نے جاری کیا، میرے والد نے اس میں پڑھایا اور اب میں پڑھا رہا ہوں۔'' آگ مستقل روشن رہتی ہے۔ رات کو یہ روشنی کا کام دیتی ہے جس میں طلبہ پڑھتے ہیں۔ دن میں اس آگ پر کھانا پکایا جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ مدرسہ کے لیے غلہ جمع کرا دیتے ہیں۔ بھیڑ، بکری کا گوشت دلا دیتے ہیں۔ سب چیزیں ایک بڑے برتن میں پکا لی جاتی ہیں اور استاد شاگرد سب ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔ استاد شاگرد ایک خاندان کے ایک کنبہ کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔ مغربی اقوام کے استبدادی دور میں ابتدائی تعلیم کا یہ نظام برقرار رہا۔ یہ نہایت سادہ اور کم خرچ نظام ہے۔

پاکستان کی ضرورت

ہمیں پاکستان میں سادہ اور کم خرچ نظامِ تعلیم درکار ہے۔ سرمایہ دارانہ مغربی نظامِ تعلیم ہماری مشکلات کا حل نہیں ہے۔ اس طریقہ سے تو ہم صدیوں میں بھی اپنی قوم کو خواندہ نہیں بنا سکیں گے۔ ہمارے یہاں 'مکتب' کی تعلیم فی سبیل اللہ کی قیمتی روایات موجود ہیں۔ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ سے عالمِ اسلام کے شہروں اور گاؤں میں ان روایات پر عمل ہوتا رہا ہے۔ پاکستان میں مسئلہ تعلیم کا حل تعلیم فی سبیل اللہ کی تابندہ روایات کو زندہ کرنے میں مضمر ہے۔ ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد کر کے ان شاندار روایات کو پھر اپنانا چاہیے۔

تعلیم فی سبیل اللہ

تعلیم فی سبیل اللہ کے پانچ ستون ہیں۔ مدرسہ، استاد، طلبہ، نصاب اور ہمدرد معاشرہ۔۔۔ احیاء کے نقطہ نظر سے ہمیں ان پانچوں عناصر کا جائزہ لینا چاہیے۔

مدرسہ

مسلمانوں کا مدرسہ مسجد کی صورت میں آج بھی ہر گلی کوچہ میں موجود ہے۔ ابتدائی چار صدیوں تک مسجد کے علاوہ کہیں اور تعلم ہوتی ہی نہیں تھی۔ مسلمانوں کے دور عروج میں مساجد میں دینی اور دنیوی، مختلف علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ماہر اساتذہ مسجد میں آ کر جدا جدا حلقہ قائم کرتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں۔

''میں نے جامع منصورہ، بغداد میں 50 تک حلقہ ہائے تدریس دیکھے۔ جن مفسرین، فقہا مذاہب اربعہ، مسلک ظاہری، قراء، متکلمین، صوفیا، واعظین، نحوی، شعراء اپنے حلقے جداگانہ لگاتے تھے۔ ایک جگہ قُبَّۃ: الشعراء کے نام سے موسوم تھی، جہاں شاعر اپنا تازہ کلام سناتے تھے۔ ایک جگہ قاضی اپنی عدالت جمائے ہوئے ہوتا تھا۔''

ہر شخص کو آزادی تھی کہ اپنے ذوق کے مطابق جس حلقے میں چاہے بیٹھ جائے۔ یہ آزاد کلاسیں تھیں۔ یہ اس دور کی 'اوپن یونیورسٹی' تھی۔ ان تابندہ روایات کو ہم زندہ کر سکتے ہیں، اور کم از کم اس دینی تعلیم کے جو فرضِ عین ہے اور ناخواندگی دور کرنے کے لیے مسجد کو مرکز بنایا جا سکتا ہے۔ عدم تسلسل سے آج معاشرہ ان روایات سے بے گانہ ہو گیا ہے۔ مسجد میں درس و تدریس کی وجہ سے سارے تعلیمی عمل پر عظمت و تقدس کی فضا کا سایہ ہو گا اور یقیناً اس سے استاد اور شاگرد کی ذہنیت میں خوشگوار تعمیری فرق آ جائے گا۔ اور ان اخلاقی صفات کو جلا ملے گی۔

طلبہ

طلبہ بھی حصولِ علم فی سبیل اللہ کے جذبہ سے کریں گے۔ کوئی فری مالی منفعت ان کے پیش نظر نہ ہو گی۔ ان کا اخلاص تعلیم کو نتیجہ خیز بنائے گا اور تعلیم کا اصل مقصد یعنی کردار کی تعمیر حاصل کرنے میں کامیابی ہو گی۔

اساتذہ

سب سے اہم مسئلہ استاد کا ہے۔ مادی تہذیب نے استادوں کی ذہنیت زر پرست بنادی ہے۔آج کوئی کام مادی منافع اور معاوضہ کے بغیر کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہا۔ ایسی فضا میں اور ان ہی استادوں میں تعلیم لِوَجہِ اللہ اور فی سبیل اللہ کے جذبہ کو بیدار کرنا ہے۔ باوجود دینی اور اخلاقی انحطاط کے، ابھی تک مسلمان معاشرہ میں ایسے افراد بالکل ناپید نہیں ہیں، جو فی سبیل اللہ تعلیم و تدریس کے لیے تیار ہو جائیں۔ بشرط یہ کہ بات کو صحیح انداز سے، اخلاص اور استقامت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس ساری کدو کاوش کا مقصود آخرت میں اجر و ثواب کا حصول اور صرف رضائے الٰہی ہو۔ یہ جذبہ اگر بیدار ہو جائے تو آج بھی ہر شخص استاد بن سکتا ہے اور فی سبیل اللہ تعلیم دے سکتا ہے خواتین بھی گھروں میں مشغولیت کے ساتھ بچیوں کو تعلیم دے سکتی ہیں۔

نصاب

نصاب اسی طرح، فی سبیل اللہ نظامِ تعلیم، کے لیے ایک حد تک کارگر ہو سکتا ہے۔ جب کہ یہاں کم از کم درج ذیل امور کی تعلیم دی جائے۔

قرآن مجید، نماز، روزہ، دین کی بنیادی باتیں۔ اردو زبان اور انگریزی زبان کی تعلیم، عربی میں املاء۔

تحریر و تقریر کی مشق، ابتدائی ریاضی اور حساب رکھنا، وغیر

ہمدرد معاشرہ

چوتھا اور اہم ستون ہمدرد معاشرہ ہے۔ معاشرہ کے بااثر افراد اس اسکیم کے ساتھ تعاون کریں، اس کے حق میں کلمۂ خیر کہیں۔ ہمت افزائی کریں۔ اصحابِ خیر اس راہ میں اپنا مال صرف کریں۔ اصحاب فراغت اس راہ میں اپنا وقت صرف کریں۔ ہمدرد معاشرہ، اس تعلیمی اسکیم کے تمام اخراجات کی کفالت کرے۔ اصحابِ خیر کے تعاون کی شکل یہ ہو سکتی

ہے کہ، چند اصحابِ فہم و فراست مل کر اس کام کی سرپرستی کریں اور انتظامی اور مالی امور کو سنبھال لیں۔

اس ساری اسکیم میں جو بات ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت رکھتی ہے اور جس بات کو طلبہ، اساتذہ اور ہمدرد ہمیشہ پیش نظر رکھیں، جو کسی لمحہ بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو، وہ یہ ہے کہ یہ سارا کام لِوَجہِ اللہ، فی سبیل اللہ ہے۔ محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اور آخرت میں اجر وثواب حاصل کرنے کے لیے ہے۔ اگر نیتوں میں اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور کامیابی دیتا ہے اور برکت نازل فرماتا ہے۔ اسباب و وسائل بھی وہی فراہم کرتا ہے۔

وما علینا الا البلاغ

1۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔

”تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔“ (مائدہ۔44)

اس آیت کے پیش نظر بہ نظر احتیاط قرآن مجید کی تعلیم پر اجرت لینے کو اور دوسری طاعات پر اجرت لینے کو علما ناجائز سمجھتے تھے۔ تین ابتدائی صدیوں تک علماء بالاتفاق، سب طاعات کی اجرت کو مطلق منع فرماتے تھے۔ تعطل اور عدم تسلسل کے اندیشہ کے پیشِ نظر فقیہ ابواللیث سمرقندی (373ھ) اور امام فضلی (381ھ) نے تعلیم پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا۔ تعطل کا اندیشہ دوسری طاعات کے متعلق بھی پیدا ہونے لگا تو آٹھوی صدی ہجری میں صاحب مختصر وقایہ (747ھ) اور صاحب درالمختار (788ھ) نے امامت اور اذان کی اجرت لینے پر جواز کا فتویٰ دیا۔ درحقیقت عدم دلچسپی اور تعطل کے اندیشہ سے ان علماء نے جواز اجرت کا فتویٰ دیا ہے۔ جو آج کل کے حالات میں تعلیم کے کسی بھی نظام میں معمول کی بات ہے۔ بلکہ اب تو اساتذہ کے لیے گرانقدر مشاہرے، معاشرے میں استاد کے باوقار مقام کی

ضمانت قرار دیے جاتے ہیں۔

2۔ ''اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔'' (حدید۔7)

3۔ ''ان کے مالوں میں حق تھا سائل کے لیے اور محروم کے لیے'' (ذاریات۔19)

4۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندو راہنماؤں نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مغربی لباس اور مغربی معاشرت کو لازمی نہیں سمجھا۔ راجہ رام موہن رائے، رابندر ناتھ ٹیگور، تلک، گوکھلے، رانا ڈے، سی آر داس، دیش بندھو، گاندھی، نہرو، پٹیل سب کے سب مغربی تعلیم گاہوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد تھے۔ مگر کسی نے نہ اپنا ہندوانہ لباس ترک کیا اور نہ ہندوانہ معاشرت ترک کی۔ مسلمانوں میں فرنگی لباس کے رواج کی یہ ''سوغات'' سر سید احمد خاں مرحوم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزی پڑھنا ہے تو اپنا لباس بھی ترک کرو اور اپنی معاشرت بھی ترک کرو۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ اپنے معاشرے کے ساتھ وابستہ رہا اور مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ اپنے معاشرے سے کٹ گیا۔